مرزا محمد رفیع سودا

(تحقیقی و تنقیدی جائزے)

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مرزا محمد رفیع سوداؔ

تحقیقی و تنقیدی جائزے

(تحقیقی وتنقیدی جائزے)

مرتبہ:

پروفیسر نذیر احمد

Mirza Mohd. Rafi Sauda
Tahqiqi -o- Tanqidi Jaizay
By:
Prof. Nazir Ahmad

اہتمام	:	شاہد ماہلی
کمپیوٹر کمپوزِنگ	:	محمد عمر کیرانوی
سالِ اشاعت	:	۲۰۰۱ء
قیمت	:	۱۵۰/روپے
مطبوعہ	:	عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،
ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲

Hasnain Sialvi

باسمہ تعالیٰ

پیش لفظ

میرزا محمد رفیع سوداؔ پر جو سمینار گذشتہ سال نومبر غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ نگرانی ہوا تھا۔ اس میں پیش ہونے والے اکثر مقالے غالب نامے کے اس شمارے میں شامل ہیں۔ ان میں بیشتر مقالے تنقیدی ہیں، ان سے بلاشبہ سوداؔ کی شاعری کی عظمت معلوم ہوتی ہے، لیکن ایسے مقالے بہت کم ہیں جو اس زمانے کی سیاسی و سماجی حالات کا پرتو ہوں، دراصل سوداؔ اپنے زمانے کے حالات سے بہت متاثر تھے، اس کی بنا پر ان کی شاعری میں اس کا عکس ہے، لیکن مقالہ نگاروں نے اس نقطۂ نظر سے اکثر گریز کیا ہے، اگرچہ مکمل گریز تو ممکن نہ تھا۔ اکثر مقالوں میں اس دور کی سیاسی و سماجی حالات کا عکس نظر آتا ہے لیکن یہ موضوع گہرے مطالعے کا متقاضی ہے۔ پروفیسر ظہیرالدین ملک اور پروفیسر اقتدار حسین صدیقی تاریخ کے پروفیسر ہیں، ان کے مقالات میں تاریخی و سماجی پس منظر کا عکس ہے، لیکن ان سے اور زیادہ گہرے مطالعے کی توقع تھی۔

دراصل اٹھارہویں صدی جس میں سوداؔ پروان چڑھے وہ ہندوستان کی سیاسی بدحالی کا دور تھا، اور سوداؔ اس بدحالی سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اکثر نظموں سے اس کی بھرپور عکاسی کی، بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر اس دور کی سماجی تنزلی سے متاثر ہیں، اور ان کی اکثر نظموں میں یہ عنصر کافی نمایاں نظر آتا ہے، اور بلا خوف تردد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو کے کسی شاعر کے کلام میں اپنے زمانے کا ایسا عکس نظر نہیں آتا جتنا سوداؔ کی شاعری میں، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ سوداؔ نے اپنے زمانے کی عوامی زبان و بیان کا جتنا استعمال کیا ہے ویسا کسی شاعر کے یہاں نہیں، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کسی مقالہ نگار نے خاصۃً اس کو اپنا موضوع مقالہ قرار نہیں دیا، شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ موضوع عمیق مطالعے کا متقاضی ہے جو بڑی توجہ کے بغیر لکھا نہیں جاسکتا۔ یہ بات بڑی حیرت کی ہے کہ ''سوداؔ'' موضوع سمینار ہو، اس میں ایک مقالہ بھی ایسا نہ پیش کیا گیا ہو جو اس عہد کی سیاسی، سماجی، لسانی پس ماندگی کا عکاس ہو، جو خود سوداؔ کا دل پسند موضوع تھا۔ سوداؔ نے اپنے دور کے پیشہ وروں کے خصایص مخصوصاً ان کی زبان کا چربا اتارا ہے، اگرچہ یہ موضوع وسیع اور دلچسپ ہے لیکن اس پر ایک بھی مقالہ نہیں، اس کو چھوڑیے قصیدہ نگاری تو صنف

شاعری کی مشہور و مقبول صنف ہے اور سودا نے اس صنف پر کافی تخصص برتا بلکہ اگر کہا جائے کہ وہ پہلا شاعر ہے جس نے اردو شاعری کی اس اہم ضرورت کو پورا کیا ہے تو غلط نہ ہوا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس صنف شاعری کو کسی مقالہ نگار نے اپنے مقالے کا موضوع نہیں بنایا۔ اس سے زیادہ افسوس کا مقام کیا ہوگا کہ شاعری کے اس صنف کو یک قلم نظرانداز کیا جائے۔ یہ نظراندازی خصوصاً زیادہ قابل اعتراض ہو جاتی ہے جب سودا جیسے قصیدہ نگار کے ضمن میں ان کی قصیدہ نگاری پر ایک مقالہ نظر نہ آئے، اسی کے پیش نظر ہمارے بعض دوستوں نے کہا کہ سودا کی قصیدہ نگاری پر الگ سے سمینار ہو اور کچھ ایسا لگتا ہے کہ آیندہ کے یک روزہ سمینار میں سودا کی قصیدہ نگاری کو موضوع قرار دیا جائے گا۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے سودا کا دور بڑی سیاسی و سماجی بدحالی کا دور ہے، چنانچہ وہ اس سے بہت متاثر ہوئے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ سودا کے کلام سے اس دور کی سیاسی و سماجی حالات کے خدوخال جمع کیے جائیں اور ان سے تاریخی بصیرت حاصل کی جائے۔

دراصل ہمارے اس سمینار سے جو بات کھل کر سامنے آئی ہے، یہ ہے کہ قصیدہ نگاری سے ہمارا تعلق ختم ہوتا جارہا ہے۔ لیکن یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ قصیدہ ہمارے ادب کا نہایت جاندار حصہ ہے، اس کی طرف سے بے اعتنائی اپنے ادب سے بے اعتنائی کے مترادف ہے۔ اگر چہ قصیدہ نگاری سے بے توجہی کا رجحان شاعر اور عوام دونوں کا ہے لیکن تنقید نگاری کی بے اعتنائی قابل گرفت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو ادب میں قصیدہ کا حصہ بہت کم ہے، لیکن یہ کمی بے اعتنائی کا لازمہ نہیں ہونا چاہیے۔ زبان و ادب کے محقق اور نقاد کا فرض ہے کہ وہ صنف قصیدہ نگاری کی طرف متوجہ ہوں اور اسے اپنے مطالعے کا موضوع قرار دیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ فارسی شاعری میں جس سے اردو شاعری متاثر ہوئی، قصیدہ عنصر غالب کی حیثیت رکھتا ہے اور فارسی کے بڑے بڑے شاعر قصیدہ گوئی کے شاعر تھے، اگر فارسی شاعری سے قصیدے نکال لیے جائیں تو اس کی حیثیت جسد بے جان کی سی ہو جائے گی، فارسی کے صرف چند شاعر ہیں جنھوں نے غزل میں ناموری حاصل کی ہے۔ لیکن قصیدہ نگاروں کی تعداد حد شمار سے باہر ہے۔ اور فارسی قصیدے فارسی شاعری میں جزو اعظم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر چہ اردو میں قصیدے بہت کم ہیں لیکن اس کے باوجود قابل اعتبار و اعتناء ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد

علی گڑھ، ۲۱ر جون ۲۰۰۱ء

فہرست مضامین

ڈاکٹر تنویر احمد علوی

سوداؔ کی قصیدہ نگاری

قصیدہ ایک صنف شعر کے اعتبار سے مختلف عنوان ہائے شاعری میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ خصوصی اہمیت اور امتیاز اُسے وسطیٰ عہد کی شاعری میں حاصل رہا ہے۔ نئے دورِ شعر وشعور میں اُسے تحسین کی نگاہ سے نہیں بیشتر تعریض کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے زیادہ تر صنفِ قصیدہ کو دربار سے وابستہ رکھا یا درباداریوں کے آداب سے نسبت دے کر اسے دیکھنے اور پرکھنے کی شعوری یا نیم شعوری سعی کی۔

قصیدہ جہاں تک تعریف کا سوال ہے ہر زبان میں ثناء وستائش سے فکروفن کے رشتے قائم ہوتے رہے ہیں۔ مگر ایسا صرف عربی، فارسی، اردو زبان ہی میں ہوا ہے کہ قصیدہ گوئی کی باقاعدہ ایک روایت قائم ہوئی ہے۔ مگر اپنے اپنے دور کے تہذیبی اور تاریخی تقاضوں کے ساتھ قصیدے کے ذریعہ ہمیں کسی خاص دور سے وابستہ ثقافتی سچائیوں کا بھی علم ہوا ہے۔ مثلاً قصائد ''بدرِ چاچ'' میں چرخیات کا ذکر جو بطور خاص آتا ہے۔ اور جس کا اثر بعد میں دکنی شاعری میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

چرخیات فلکیات سے متعلق ہے۔ جس کا تعلق علمِ ستارہ شناسی یا ہیئت سے ہے۔
''بدرِ چاچ'' ایک شاعر ہے جو ترکستان سے تعلق رکھتا ہے جو تاشقند کی کوئی قریبی بستی ہے۔
اسی طرح ہم غالبؔ کے ایک فارسی قصیدے سے جنم کنڈلی کو جسے زائچہ کہا جاتا ہے زیرِ بحث آتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ عرفی کے قصائد میں فلسفہ و فکر کے عناصر بہت نمایاں ہیں۔ ذوقؔ کے ایک سے زیادہ اُردو قصائد میں علمی مباحث کی طرف اشارہ ہے۔ اگر ایسے بہت سے حقائق یا تاریخی سچائیوں کی طرف قصیدہ گو شعراء کے ہاں اشارے ملتے ہیں تو ہم اس کی ادبی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کے تاریخی اور ثقافتی مطالعے کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوتے؟

علاوہ بریں ہمارے وسطی عہد کی تاریخ کے اہم اداروں میں ''دربار ایک بڑا ادارہ'' ہے جس نے ہمیں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی اپنے طور پر عطا کی ہیں۔ اور کہنے اور کرنے کے آداب بھی جن کا اثر آج بھی ہماری فکر پر موجود ہے۔ اور ہمارے طریقہ رسائی کو کسی نہ کسی معنی میں دربار ہنوز متاثر کرتا ہے۔ اس دربار نے صرف خوشامد پرستی کو جنم نہیں دیا اور اس سے غلامانہ ذہنیت پیدا ہوئی ہو سرتاسر یہ بھی نہیں ہوا۔ یہ دربار کے دورِ زوال کی کہانی ہے۔ دربار کی زندگی خانقاہی روایتوں اور مدرسے کے علمی معیاروں سے بھی متاثر ہوتی رہی۔ اور اس کا اثر قصیدے پر بطورِ خاص آتا رہا۔

خانقاہی روایتوں کو دربار سے الگ کرکے ان کے معنی اور معنویت کے ساتھ سمجھا نہیں جا سکتا۔ ہمارے فنونِ لطیفہ پر جو دربار کے اثرات ہیں۔ ان کو فراموش کرکے تاریخ و روایت پر کوئی گفتگو ممکن نہیں ہے۔ زبان و بیان سے قصیدے کا جو رشتہ رہا ہے اس میں ہم ایسی روایتوں کو فراموش نہیں کر سکتے۔ جیسی انشاؔء، ذوقؔ اور خود سوداؔ کے سلسلے میں ملتی ہیں۔

ذوقؔ کے لیے دہلی اردو اخبار نے لکھا تھا کہ انہوں نے ایک ایسا قصیدہ دربارِ شاہی میں پیش کیا تھا جس میں چودہ شعر چودہ الگ الگ زبانوں میں تھے۔ اسی طرح انشاؔء کا

معاملہ بھی ہے اور خود سوداؔ کا بھی معاملہ ہے کہ انہوں نے ہندی اور پنجابی میں بھی اپنی قصیدہ نما نظموں میں اظہار خیال کیا اور ان کے بعض مرثیے بھی قصائد کے ذیل میں آئے اور ان کو سامنے رکھ کر ہم اس دورِ معاشرت کو ادب کے حوالے سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ سوداؔ کے اشعار یا بعض شعری تخلیقات کن لوگوں سے منسوب ہو گئیں۔ یہ ایک تحقیقی مسئلہ ہے۔ اور اس کا فیصلہ تقابلی مطالعے اور تحقیقی طریقہ رسائی کے ذریعے اہلِ علم ہی کر سکتے ہیں۔ سوداؔ کی طبعائی شعری شوق و شغف اور ادبی مطالعہ کی وسعت کو بحیثیتِ مجموعی ذہن میں رکھتے ہوئے ان کے قصائد، قصائد کی زبان اور ان کے ادبی محاسن پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔

بعض سوداؔ کے لیے جہاں ان کے معاصرین اور شریکِ عصر ادیبوں، تذکرہ، نگاروں اور شاعروں نے ان کو نظم اردو کا قصیدہ نگاری میں نقاشِ اول کہا۔ وہاں اس کی طرف بھی اشارہ کیا اور اس میں طعن و تعریف کا پہلو بھی موجود ہے کہ انہوں نے فارسی کے بائیس قصیدہ نگاروں کو سامنے رکھا ہے۔ یعنی ان سے استفادہ کیا ہے۔ اس سے ان کے مطالعہ کی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور ادب کی محفل ہو یا فکر و فن کا کوئی دوسرا دائرہ استفادہ کے بغیر تو ایک چراغ کے بعد دوسرا چراغ جلتا ہی نہیں اور اس دورِ زندگی میں تو ادھر کے مضامین کو ادھر لینے میں کوئی برائی نہیں تھی بڑائی کا پہلو موجود تھا۔ اگر بات بات اساتذہ قدیم "سند" مانگی جاتی تھی تو اساتذہ کے مطالعے اور ذہن میں ان روایتوں کی تفسیروں کی موجودگی کے بغیر ان کی طرف اشارہ کیسے کیا جا سکتا تھا۔ آج اسی طرح ہم مغربی تنقید اور ادبیات کے حوالے دیتے ہیں۔

اس زمانے میں فارسی ادب سے استفادہ اور تقابل قدم قدم پر ذہنوں میں رہتا اور زبانوں پر آتا تھا۔ اور اس میں ایران کے فارسی والوں کا یہ رویہ بھی شریک رہتا تھا کہ وہ ہندوستان کے فارسی والوں کو درخورِ اعتناء تصور نہیں کرتے تھے۔ "شیخ علی

حزیں" ہندوستان آئے یہاں رہے یہاں کی چیزوں کو پسند بھی کیا مگر ہماری شاعری انہیں پسند نہیں آئی۔ یہاں تک کہ آزاد کی روایت کے مطابق انہوں نے سودا کے اشعار سن کر یہ کہا:

"در پوچ گویانِ ہند بد نیستی" یعنی ہندوستان کے پوچ گویوں میں تم بُرے نہیں ہو۔ یہ بیان لسانی تفاخر اور تہذیبی تعصب سے آزاد نہیں ہے اور شاید تعصب کی یہی فضا تھی جس کے پس منظر کے ساتھ خان آرزو نے سودا کو یہ مشورہ دیا تھا۔ "کہ مرزا اب تمہاری مادری زبان فارسی نہیں رہی تم اردو ہی میں کہہ لیا کرو۔" سودا اردو میں اگر شعر کہتے اور خاص طور سے قصیدہ لکھتے ہیں تو ان کے یہاں معیار فن کی کسوٹی بہر حال فارسی ہے۔ اکتساب فیض اور استفادۂ فن بہر حال فارسی سے کیا جا رہا ہے۔ کہ اردو کے مقابلے میں فارسی کو زیادہ ترقی یافتہ تشبیہات اور استعارات سے آراستہ زبان سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اپنی زبان کو بھی رشکِ فارسی بنانے کی فکر میں پڑے ہوئے ہیں اور غالب تک آتے آتے اردو ہی رشکِ فارسی بن گئی ہے۔

سودا نے بقول مولانا محمد حسین آزاد بڑے دھوم دھام کے قصیدے لکھے اور بعض موقعوں پر فارسی قصیدہ نگاروں سے آگے نکل گئے ہیں۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ سودا فارسی قصیدہ نگاروں سے آگے نکل گئے ہیں۔ یہ تو اسی وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ فارسی قصیدہ نگاروں سے ان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور قصیدہ بہ قصیدہ کیا جائے اور اپنی ترجیحات کو دلیل و توجیہ کے ساتھ پیش کیا جائے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ زورِ بیان قدرتِ کلام ندرتِ فکر اور جدتِ ادا کے اعتبار سے سودا کے قصیدے غیر معمولی ہیں اور قدیمانہ یا روایت پسندانہ معیار فکر و فن کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔

سودا کی قصیدہ گوئی کا شہرا، اعتراف و احترام ان کے معاصرین اور شعراے مابعد نے کیا ہے۔ خود سودا بھی اپنے ایک شعر میں اس انداز سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

جو یہ کہتے ہیں کہ سوؔدا کا قصیدہ ہے خوب''
سامنے ان کے میں لے کر یہ غزل جاؤنگا

یہاں تو وہ اپنی غزل کا اعتراف کرانا چاہتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے موقعہ پر تو وہ یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اب سامنے میرے جو کوئی پیرو جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ میرے منھ میں زباں ہے

میں حضرتِ سوؔدا کو سنا بولتے یارو
کیا قدرتِ الفاظ ہے کیا زورِ بیاں ہے

سوؔدا نے یہ تعلّی کے طور پر کہا ہے لیکن اس سے اس دورِ شعرِ شعور کا ایک گہرا رشتہ ہے۔ جب کسی کے حسنِ کلام، تخلیقی سرجوش، قدرتِ زبان اور زورِ بیان کی تعریف اسی طرح کی جاتی تھی الفاظ اپنے معنی اور معنویت کے اعتبار سے صرف کسی زبان سے متعلق نہیں ہوتے تاریخی دور سے وابستہ ہوتے ہیں۔